ڈاکٹر روبینہ ترین / محمد خاور نوازش

پروفیسر و صدر شعبہ اردو، بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ، ملتان

استاد شعبہ اردو، بہائو الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

مطالعۂ فیضؔ: نئے پیراڈائم کی تلاش

Dr. Rubina Tareen

Prof. Head Department of Urdu,

Bahauddin Zakariya University, Multan

Muhammad Khawar Nawazish

Department of Urdu,Bahauddin Zakariya University, Multan

The Faiz Study: A Search of New Paradigms

Urdu critics have been studying Faiz Ahmed Faiz and his works in a limited, though popular, framework. There are plenty of issues from his works to be discussed by the research scholars other than resistance and revolution. In this regard, Pindi Conspiracy Case and his Marxist bent of mind are too obvious to be ignored. It was the controversial side framed by these notorious issues that Faiz could never be portrayed in secondary and higher education in his fullest essence. This article introduces these paradigms so that the future scholarly work might be done on innovative grounds.

کسی تخلیق کار کے فکر وفن کے حوالے سے بعض اوقات جب ایک خاص طرح کا تصور خاص نوع کے لکھاریوں کی زُود نویسی کی وجہ سے اتنا عام ہو جاتا ہے کہ ہر سطح کے محققین، ناقدین اور طالب علم اُس تخلیق کار کے فکر وفن پر بات کرنے سے پیشتر مرّ وجہ تصور کو بطور مفروضہ سامنے رکھنے لگتے ہیں، ایسے میں ایک طرف جہاں اُس تخلیق کار پر مطالعہ کے موضوعات محدود رہ جاتے ہیں وہاں کسی نئے پیراڈائم کی طرف توجہ مبذول ہونا بھی کم ہو جاتا ہے۔ فیض احمد فیضؔ (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۴ء) اُردو دنیا کا ایسا نمائندہ نام ہیں جن پر تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا بہت سے کام ہو جانے کے باوجود آج بھی اُن کی شخصیت اور فکر کے کچھ گوشے

ایسے دکھائی دیتے ہیں جن پر کسی نقاد یا محقق نے ہیبتِ مقتدرہ کے خوف سے یا پھر اپنی خاص طبیعت کی بنا پر وہ توجہ نہیں دی جس کے وہ متقاضی تھے۔ مطالعۂ فیض کے ضمن میں کسی نئے پیراڈائم کی تلاش کے بجائے آج کا قاری بھی انقلاب کی اصطلاح کو ایک نعرے کے ضمن میں دیکھتے ہوئے فیضؔ کو پڑھنے میں مگن دکھائی دیتا ہے اور ہماری دانش گاہوں میں یہی ایک حوالہ اکثر اوقات مطالعۂ فیض کی روایت کے عدم فروغ کا سبب بنا رہا جو دراصل فیضؔ کی شخصیت اور فکر کی بہت سی جہات پر اعلیٰ معیار کی تحقیق نہ ہونے کی وجہ سے تھا، فیضؔ کی تخلیقات کو صحیح تناظر میں اور نئے زاویے سے سمجھنے کے بجائے اس موضوعِ مطالعہ کو ہی متنازعہ قرار دیا جاتا رہا۔ رواں برس فیضؔ سالہ تقریبات کے سلسلے میں اُن کے ہم عصروں اور کچھ نئے لوگوں نے اس رجحان کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے مطالعۂ فیض کے ضمن میں نئے زاویے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس روایت کو فروغ ملنا ضروری ہے۔

فیضؔ کی پہچان کے کئی حوالے ہیں لیکن بنیادی حوالہ شاعری ہے اور اس ضمن میں ان کی تخلیقات کو مزاحمت کا استعارہ کہنا کسی طور پر غلط نہ ہوگا۔ جو لوگ انھیں انقلابی شاعر کہہ کر مخاطب کرتے ہیں وہ بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ انقلاب کا ہر نعرہ بنیادی طور پر مزاحمت اساس ہوتا ہے۔ فیضؔ کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں موجود مزاحمت کو کبھی بھی نعرہ نہیں بننے دیا بلکہ ایک ایسے مربوط فلسفے کے طور پر پیش کیا جس میں نظریے کے ساتھ ساتھ ایک راہِ عمل کے تعین کی خوبی بھی موجود ہے۔ وہ جس ادبی تحریک سے وابستہ ہوئے وہ اُردو دنیا میں ادب تخلیق کرنے اور اُسے پرکھنے کے تمام رائج پیمانوں سے رُوگردانی کرتے ہوئے مقصدیت پر مبنی نئے آدرش کا سبق دے رہی تھی، ایک ایسا آدرش جس میں اپنے عہد کی طبقاتی کشمکش اور ہر طرح کے استحصال کا صرف نوحہ نہ ہو بلکہ اس جمود کو توڑنے اور فضا میں تغیر پذیری کا پیغام بھی ہو۔ فیضؔ اس آدرش کا اظہار یوں کر رہے ہیں کہ

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بام حرم کرتے رہیں گے
اقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رُخسار صنم کرتے رہیں گے

(نسخہ ہائے وفا،
ص ۱۱۹، ۱۲۰)

ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ ہر ادیب اور شاعر کو اسی آدرش کی بنا پر اپنے عہد سے بغاوت کرنے والوں میں شمار کیا گیا اور ان پر ہر طرح سے قدغن لگائی گئی یہاں تک کہ قیامِ پاکستان کے بعد جب ۱۹۵۴ء میں ترقی پسندوں کو سیاسی ایجنٹ قرار دے کر ان پر پابندیاں عائد کی گئیں تو اُس کے بعد خواہ منٹو ہو یا فیضؔ چھوٹے درجے سے بڑے درجے تک پڑھائے جانے والے نصاب میں بھی ان ادیبوں کی تخلیقات کو شامل کرنا ممنوع قرار پایا۔ پاکستان اپنے قیام کے فقط دس برس بعد آمریت کے سایے تلے آ گیا جس نے اس روایت کو مزید تقویت دی۔ فیضؔ کی ایک طرف ترقی پسند ادبی تحریک کے لیے خدمات سامنے تھیں اور دوسری طرف ۱۹۵۱ء میں بننے والے پنڈی سازش کیس نے اُن کی شخصیت کو مزید متنازعہ بنا دیا۔ فیضؔ کی شخصیت اور فکر سے جڑے ہوئے ایسے تصورات جنھوں نے اُن کے بارے میں لوگوں کی مخصوص ذہن سازی کی آج بھی اُسی طرح تحقیق طلب ہیں:

i۔ ''پنڈی سازش کیس'' کی اندرونی کہانی کیا تھی اور اس میں فیضؔ کا کتنا حصہ تھا یہ ایک ایسا تحقیق طلب موضوع ہے جس پر تا حال کوئی ڈھنگ کی کتاب سامنے نہیں آئی۔ حسن ظہیر کی کتاب ایک ریٹائرڈ بیوروکریٹ کی اپنی ذہنی اُلجھنوں کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ انہیں جو کچھ مواد سی آئی ڈی کے اہلکاروں کی رپورٹوں پر مبنی میسر آیا اسے ہی انہوں نے اپنی کتاب کی اساس بنایا اور کوئی خاص نتائج اخذ کیے بغیر انہی رپورٹوں کی بنیاد پر فیضؔ کو مجرم قرار دیا۔ ضرورت ہے کہ اس حوالے سے تحقیق کی جائے کیونکہ مطالعۂ فیض کی روایت میں بہر حال اس واقعے کو اُن کے فکر اور فن سے الگ کر کے نہیں دیکھا گیا۔

ii۔ فیض اور استعمار دشمنی کے حوالے سے بھی کوئی خاص کام نہیں ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون مشمولہ جدید ادب بھی اِس معاملے کی دھند کو صاف نہ کر سکا کہ فیضؔ نے کس تناظر میں برٹش آرمی میں شمولیت اختیار کی۔ فیضؔ کی استعمار مخالفت کا ان کے کلام اور دیگر شواہد کی روشنی میں ایک تحقیقی جائزہ بہت کارآمد واقع ہوگا۔

iii۔ فیض کے انگریزی تراجم شاید اپنے ہم عصروں کی نسبت بہت زیادہ اہم ہیں اور معروضی انداز میں ان کا جائزہ لیا جانا بھی ضروری ہے۔

iv۔ فیض پر اب تک جو تحقیق اور تنقید لکھی گئی ہے اس کا محاکمہ بھی ضروری ہے۔ فیضؔ پر لوگوں نے کس تناظر میں کیا لکھا ہے اور ان کے اپنے تعصّبات کیا ہیں، ان کا جائزہ بھی فیض شناسی کے باب میں اہم ہے۔ اثر لکھنوی سے لے کر رشید حسن خان اور وزیر آغا سے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی تک جن لوگوں نے فیضؔ کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے ان کا جائزہ لیا جانا بھی ضروری ہے۔

فیضؔ کا ہر باشعور قاری اس بات سے متفق ہوگا کہ وہ ایک انسان دوست شاعر تھے اور یہی فلسفہ اُن کے تخلیقی عمل کی بنیاد تھا۔ مطالعۂ فیض کے ضمن میں اگر اُن کی شاعری کے حوالے سے دیکھا جائے تو ''آج بازار میں پا بہ جولاں چلو'' ایسی ایک آدھ نظم ہی اُن کے مخالفین یا یوں کہہ لیں کہ اُن سے خائف طبقے کی نظر میں پوری شاعری کو مزاحمت اور اس سے ایک قدم آگے

بڑھ کر بغاوت کی شاعری قرار دینے کے لیے ہمیشہ کافی رہی۔ سید سبطِ حسن لکھتے ہیں کہ:

> سرکاری حکام کے حقارت آمیز رویے پر انھوں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر اُن کے حساس دل کے اتھاہ اور پُرسکون سمندر کی تہہ میں جذبات کا تلاطم برپا ہو گیا اور تب اشعار کے آبدار موتی ڈھلنے لگے، ''شورشِ زنجیر بسم اللہ'' اور ''آج بازار میں پابہ جولاں چلو'' میں انھوں نے اپنے ساتھیوں کے تجربوں کو جس شدت سے محسوس کیا ایسی شدت تو اہلِ ستم کی جفاؤں میں بھی نہ تھی۔ (۱)

''زنداں نامہ'' اور اس کے بعد کی شاعری میں فیضؔ کی جو شخصیت ابھر کر سامنے آ رہی ہے وہ صرف انسان دوست نہیں بلکہ استبداد کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرنے والے شاعر کی ہے جس کے درج ذیل ایسے اشعار کو ایک فوجی آمر کے خوف سے ان کی کلیات مرتب کرتے ہوئے اس میں شامل ہی نہیں کیا جاتا:

اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

دراصل یہی وہ پیغام ہے جو فیضؔ کے کلام کو سرکار نواز نصاب سازوں کی نظر میں ہی متنازعہ نہیں بناتا بلکہ اسے سرکاری جامعات میں پڑھایا جانا اور اس پر تحقیق اور تنقید کی راہیں کھولنا گویا ہیتِ مقتدرہ کے خلاف بغاوت پر اُکسانے کے مترادف قرار دیا جاتا رہا۔

ایک اور اہم بات کارل مارکس کے فلسفہ سے فیضؔ کا خاطر خواہ لگاؤ ہے۔ اُس دور میں کہ جب وہ خود ایک مدرس کے طور ایم اے او کالج امرتسر سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کر رہے تھے، مارکسی فلسفے سے متعلق بہت سا ادب اُن کے زیرِ مطالعہ رہا اور محمود الظفر اور رشید جہاں ایسے روشن خیال تخلیق کاروں کی معیت میں انھوں نے ہندوستان کے دریچوں پر انقلابِ روس کی آہٹ سننا شروع کی۔ اسی دور سے فیضؔ کی مارکسی فکر سے وابستگی کا ایسا رشتہ قائم ہوا جو آخر تک ایک سہانے خواب کی تعبیر تلاش کرتا ہوا اُن کے اندر زندہ رہا۔ اسی فلسفے اور سویت یونین سے لگاؤ کی بنا پر انھوں نے برٹش انڈین آرمی میں شمولیت اختیار کی لیکن اُن کے مخالفین اس بات کو پورے سیاق کے ساتھ سمجھنے کے بجائے اِسے استعمار کے ساتھ کھڑا ہونے سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ مطمعِ نظر ہندوستان میں رہتے ہوئے ایک ایسے اتحاد میں شامل ہونا تھا جس میں سوویت روس بھی شامل تھا اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کو انگریزوں کے بعد جاپان ایسی دوسری سامراجی طاقت کے چنگل میں پھنسنے سے بچانا تھا۔ اسی دور میں فیضؔ کے کمیونسٹ پارٹی کے لوگوں سے روابط قائم ہوئے جو تاعمر قائم رہے اور استعمار دوست کے علاوہ کمیونسٹ ہونے کا لیبل بھی ان کی ذات کا حصہ بن گیا جو پنڈی سازش کیس میں دھرے جانے کے بعد مزید مضبوط ہوا یہاں تک کہ کیس سے رہائی کے بعد بھی وہ اُن کمیونسٹوں میں شمار ہوتے تھے جن سے حکومتِ وقت ہمیشہ خائف رہتی۔ ایوب خان کے دور میں عمل میں آنے والی اپنی

ایک گرفتاری کے بارے میں بتاتے ہیں کہ:

> ہم جب گرفتار ہوئے تو ہم نے پوچھا بھئی ہمیں کس شوق میں گرفتار کیا گیا ہے۔ ہم نے تو کچھ نہیں کیا اور ہم یہاں تھے بھی نہیں۔ ہمیں تو حکومت کی طرف سے ماسکو بھیجا گیا تھا۔ اس پر جواب ملا ہاں آپ نے کچھ نہیں کیا ہے اور ہم نے بھی آپ پر کوئی الزام نہیں لگایا ہے۔ آپ کو تو محض احتیاطاً قید میں رکھا ہے۔ جب ہم یہ سمجھیں گے کہ حکومت کو آپ سے کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے تو آپ کو چھوڑ دیں گے یا پھر ایک صورت یہ ہے کہ آپ لکھ کر دے دیں کہ آپ حکومت کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کریں گے۔ ہم نے کہا اس میں لکھ کر دینے کی کوئی بات نہیں کیونکہ ہم ایک زمانے سے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لے رہے ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا اچھا پھر آپ یہ لکھ کر دے دیں کہ آپ حکومت کا ساتھ دیں گے۔ (۲)

گویا فیضؔ کی فکر اور عملی زندگی میں اُن کا خاص سیاسی مسلک بھی اُن کی متنازعہ تصویر کشی کا کھلا سبب بنتا رہا۔ پھر ایک مرحلہ وہ آیا جب انھیں لینن امن انعام سے نوازا گیا، اُس وقت تک فیضؔ کی بابت اربابِ اختیار کی جو آراء قائم ہونا تھیں وہ ہو چکی تھیں اس لیے انعام وصولی کی تقریب میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے اب ایک قدم آگے بڑھ کر کھلے الفاظ میں اُنھوں نے لینن کی تعلیمات سے اپنے لگاؤ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

> لینن امن انعام کی عظمت تو اسی ایک بات سے واضح ہے کہ اس کے ساتھ لینن کا محترم نام اور مقدس لفظ وابستہ ہے۔ لینن جو دورِ حاضر میں انسانی حریت کا سب سے بزرگ علمبردار ہے اور امن جو انسانی زندگی اور اس زندگی کے حسن و خوبی کی شرطِ اول ہے۔ مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی کام نظر نہیں آتا جو اس عظیم اعزاز کے شایانِ شان ہو لیکن اس عزت افزائی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کی وابستگی رہی ہے یعنی لینن امن اور آزادی کی تمنا وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے ان کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزت افزائی کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ (۳)

لینن نے کس آزادی کی بات کی تھی جس کا ذکر یہاں فیضؔ کے الفاظ میں آیا ہے، یقیناً استحصالی قوتوں سے آزادی کی اور فیضؔ کا وطن تو اپنے قیام کے بعد سے اُن کے زندہ رہنے تک بلکہ آج تک بھی اُن استحصالی طاقتوں کے چنگل سے آزادی حاصل نہیں کر سکا گویا آج بھی جب فیضؔ کی تعلیمات کو عام کرنا اور اُن کے الفاظ کو دانش گاہوں میں دہرایا جانا غیر مناسب سمجھا جائے اور ادب کے اساتذہ بھی اُن کی فکر کو نصاب کا حصہ بنانا اور اس پر تحقیق و تنقید کی راہیں کھولنا مزاحمت اور بغاوت کی راہ ہموار کرنے کے مترادف سمجھیں تو اس کا مطلب سوائے اس بات کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ آج بھی ہم پچاس برس پہلے کے عہد میں کھڑے ہیں اور روشن خیال مخالف سوچ اور رویہ آج بھی اُسی طرح زندہ ہے۔ اس میں یقیناً تبدیلی آنی چاہیے، اس ایک پہلو کو دیکھ کر ہی سہی کہ اب تو ہمارے ملک کی مذہبی جماعتوں کے قائدین بھی اپنے جلسوں میں فیضؔ کے اشعار پڑھتے دکھائی دیتے ہیں گویا فیضؔ کسی ایک مخصوص سیاسی مسلک یا طبقے کا شاعر نہیں رہا بلکہ آفاقی سطح پر اپنی پہچان بنا چکا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ جامعات میں مطالعہ فیضؔ کی روایت کو فروغ دینے اور تدریساتِ فیض کا فریضہ ذہن کو کشادہ کر کے انجام دینے کا رجحان پیدا

نہیں ہو رہا۔ فیضؔ کی عملی سرگرمیوں سے ممکن ہے کسی ایک طبقہ فکر کے لوگوں کو اختلاف ہو لیکن جب وہ اپنی نظم 'مظلوم' میں یہ کہتے ہیں:

اے خدا، یہ مری گردانِ شب و روز و سحر
یہ مری عمر کا بے منزل و آرام سفر
کیا یہی کچھ مری قسمت میں لکھا ہے تُو نے
وہ یہ کہتے ہیں کہ ہر اک ظلم ترے حکم سے ہے
گر یہ سچ ہے تو ترے عدل سے انکار کروں؟
اُن کی مانوں کہ تری ذات کا اقرار کروں؟
(نسخہ ہائے وفا، ص ۲۱۸)

تو اس میں تو وہ پوری انسانیت کی آواز بن کر سامنے آتے ہیں گویا ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ کلامِ فیضؔ کے متن کی قاری اساس یا متن اساس توضیح سامنے آئے اور مطالعۂ فیض کی رائج روش سے ہٹ کر اُن کے کلام کی بازتشکیل سے فیضؔ کی متنازعہ شخصیت کے بجائے ایک انسان دوست شاعر کو تلاش کرنے کی سعی کی جائے۔ فیضؔ نے خود ایک جگہ کہا تھا کہ نظامِ زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا، سنگ بستہ، مقید پانی نہیں ہے جسے تماشائی کی ایک غلط اندازِ نگاہ احاطہ کر سکے[۴] سو اس لئے نظامِ زندگی کی ایک ارتقائی صورت پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے مختلف چیزوں کو پرکھنے کے پیمانے بھی تبدیل ہوتے رہنے چاہئیں اور کسی تماشائی کے متعصب اندازِ نگاہ سے کیے گئے احاطہ پر یقین کر لینے کے بجائے بازیافت کا عمل جاری رہنا ضروری ہے تاکہ ایک منفرد نقطۂ نظر کے ساتھ کچھ نئے نتائج برآمد ہو سکیں۔

فیض شناسی کی روایت کے ضمن میں اگر ہم لدمیلا وسیلیوا کی درج ذیل رائے کو مدنظر رکھیں تو ایک نئی تعبیر سامنے آسکتی ہے:

> ان کی سب نظمیں اور غزلیں شاعر کی زندگی اور ان کے دور کی ایک مسلسل اور بہ منطق داستان کی یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ نفسیاتی نوعیت کے ایک ایسے منفرد ناول کی حیثیت رکھتی ہیں جن کا صرف ایک مرکزی کردار یعنی خود شاعر ہے اور جو واقعات پر نہیں بلکہ جذبات اور تصورات، مختلف رنگوں اور سایوں، دھواں دھواں سے پیکروں اور احساسات پر بنی ہے۔ (۵)

ممکن ہے یہ موضوعات بالکل نئے نہ ہوں لیکن فیضؔ سالہ تقریبات کے سلسلے میں شائع شدہ کتب، جرائد کے نمبروں اور مختلف کانفرنسوں میں پڑھے گئے مقالات کا بھی غیر جانبداری سے مطالعہ ضروری ہے کہ یہ تعین کیا جا سکے کہ ہم فیض احمد فیضؔ پر پہلے سے موجود مواد کی ہی دوبارہ اشاعت پر اکتفا کیے ہوئے ہیں یا فیض کی فکر کی عصرِ حاضر کے مطابق کوئی نئی تعبیر بھی سامنے آئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سبطِ حسن، سید، ''سخن در سخن''، ۱۹۸۷ء، کراچی، دانیال، ص ۴۶

۲۔ فیض احمد فیض، ''متاعِ لوح و قلم''، ۱۹۸۹ء، کراچی، دانیال، ص ۳۷

۳۔ عبداللہ ملک، ''لاؤ تو قتل نامہ مرا''، ۱۹۸۵ء، لاہور، کوثر پبلشرز، ص ۸، ۹

۴۔ ظفر الحسن، مرزا، ''قرضِ دوستاں''، ۱۹۸۱ء، لاہور، مکتبۂ کارواں، ص ۸۹

۵۔ لدمیلا وسیلیوا، ''پرورشِ لوح و قلم، فیض: حیات و تخلیقات'' (مترجمہ: اسامہ فاروقی) ۲۰۰۷ء، کراچی، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ص ۲۷۷